محمد شہباز
لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور
مجاہد حسین
لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج فار بوائز شالیمار ٹاؤن، لاہور

"کئی چاند تھے سرِ آسماں": تاریخی و ادبی کردار

Muhammad Shahbaz
Lecturer, Department of Urdu, Government Islamia College, Civil Lines, Lahore
Mujahid Hussain
Lecturer in Urdu, Government Degree College for Boys Shalimar Town, Lahore.

"Kai Chand they Sar-e-Asman": Historical and Poetic Characters

Shamsur Rehman Farooqi's novel "Kai Chand They Sar-e-Asman" is ranked as one of the seminal works of the first decade of the twenty first century. In this work, Farooqi has in the wake of countours of Indo-Islamic civilization has brought out through some very living and thriving historical and literary characters. The researcher has through analytical lens brought out the exquisite way Farooqi has crafted the historical and literary characters of his novel.

Key Words: *Farooqi, Novel, Indo Islamic Civilization, Historical Characters, Poetic Characters.*

"کئی چاند تھے سرِ آسماں" عہدِ حاضر میں تخلیق ہونے والا شمس الرحمن فاروقی (۱۹۳۵ء۔۲۰۲۰ء) کا ایک ایسا ادبی شاہ کار ہے، جس میں فاروقی نے بعض ایسے کرداروں کو ناول کی کہانی میں پرویا ہے، جو اِس ناول کی تخلیق سے پہلے ہی تاریخی و ادبی سطح پر ایک منفرد مقام کے حامل تھے۔ فی الاصل اِس ناول کے بعض کردار ایک مخصوص ماحول اور انسانی معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گو کہ اِس ناول کے بیشتر کردار تاریخی و ادبی دنیا کا حصہ ہیں، تاہم مصنف نے اِنھیں ایک مؤرخ یا ناقد کی آنکھ سے دیکھنے کے بجائے ایک منجھے ہوئے ناول نگار کی نظر سے دیکھا ہے اور ناولیت پر تاریخیت کو غالب نہیں آنے دیا، تاہم ضرورت

کے مطابق تخیّل آمیزی سے کام لے کر اِن کرداروں کو زندگی کے اور زیادہ قریب کر دیا ہے۔یوں بھی کسی کردار کی اپنی ذاتی زندگی اِس قدر اہم اور قابلِ توجہ نہیں ہوتی،جس قدر کہ ایک ناول نگار اپنی قوّتِ متخیّلہ سے اُسے پُر کیف بنا دیتا ہے ۔[۱] بہ قول ڈاکٹر محمد یٰسین:

> "ناول بحیثیت صنفِ ادب کے زندگی کی واقعیت اور مصنف کے تخیل کی پیداوار ہے۔یہ نہ تو "سیرت" (Biography) ہے اور نہ "سرگذشت" (Auto Biography)۔ سیرت نگاری کے لیے صداقت بیانی اوّلین شرط ہے،مگر ناول نگاری میں واقعات اور کرداروں کو نمایاں کرنے کے لیے واقعیت کے ساتھ حسین دروغ گوئی کا بھی سہارالیا جاتا ہے۔"[۲]

غور طلب امر یہ ہے کہ اِس ناول میں فاروقی نے کردار نویسی کے لیے تشریحی اور ڈرامائی دونوں طریقوں سے کام لیا ہے۔ تشریحی انداز سے مراد یہ ہے کہ مصنف نے ناول کے بعض حصوں میں شخصیت کشائی کے لیے کرداروں کے نظریات و خیالات اور جذبات واحساسات کو بیان کرتے ہوئے اُن پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ایسے مواقع پر قاری کا دھیان مسلسل مصنف کی جانب مبذول رہتا ہے،جب کہ ڈرامائی انداز سے مراد یہ ہے کہ کردار اپنی حرکات و سکنات،اندازِ گفتگو اور اپنے چال چلن سے اپنے آپ کو بہ ذاتِ خود رُوشناس کرواتے ہوئے مجسّم صورت میں قاری سے براہِ راست ہم کلام ہوتا ہے،جس کی بہ دولت مصنف کی ذات فراموش ہو جاتی ہے۔ مؤخرالذّکر طریقہ زیادہ مستحسن خیال کیا جاتا ہے اور شمس الرحمن فاروقی نے بھی زیادہ تر اِسی حربے سے استفادہ کیا ہے۔

واضح رہے کہ اِس ناول میں سادہ یا سپاٹ(Flat Character)کردار بھی ہیں اور تہہ دار یا مکمل(Round Character) بھی۔سادہ یا سپاٹ کردار بالعموم بے جان اور بعید از حقیقت خیال کیے جاتے ہیں۔اِسی بنا پر ایسے کرداروں کو آدھے یا نا مکمل کردار(Half Character) بھی کہا جاتا ہے،جب کہ پہلو دار یا مکمل کردار جملہ انسانی اوصاف سے مملو ہوتے ہیں،تاہم اِن دونوں طرح کے کرداروں کا اکٹھے ایک ناول میں ہونا کوئی بُری بات بھی نہیں،تاہم اوّلیت اور ترجیح ثانی الذّکر کرداروں کو ہی حاصل ہے اور اِس نوع کے کردار ناول کو مدتوں تر و تازہ بھی رکھتے ہیں۔اِس ناول میں بعض کردار ایسے بھی ہیں،جن کی خواہشات اور جذبات میں آویزش کی کیفیت پائی جاتی ہے اور یہی تصادم اِس ناول کو دل کشی اور رعنائی

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

عطاکرتاہے۔گویااِس ناول میں واقعاتی ناول(Novel of Incident)اورکرداری ناول(Novel of Character) دونوں کی خصوصیات یکساں طور پر موجودہیں۔کہنا پڑتاہے کہ فاروقی کے قلم سے خلق ہونے والےیہ کردارخیالی ومثالی انسانی چربے یا کاٹھ کے گھوڑے نہیں،بل کہ گوشت پوست کے زندہ وجاویدایسے کردارہیں،جوجدیدنثری ادب کاوقیع سرمایہ ہیں۔اِس ضمن میں سیّدارشاد حیدر کی رائے بڑی صائب معلوم ہوتی ہے کہ:

> "فرضی کرداروں کے مزاج اور خط و خال واضح کرنااِتنا مشکل نہیں جتنا کہ تاریخی کرداروں کے مزاج اورخط و خال بیان کرنا۔مصنف نے کردار سازی میں ایک مصوّر جیسا کارنامہ انجام دیاہے،اُس نےلفظوں سےوہ مصوّری کی ہے کہ کردار کےمزاج، خط و خال،لباس اور اُن کی زبان،اُن کی جسمانی حرکت وغیرہ اِس قدر واضح ہوگئے ہیں جیسے وہ ہمارے سامنے موجود ہوں۔"(۳)

اِسی امرکےپیشِ نظرشمس الرحمن فاروقی نےاِس ناول کی کہانی کاتانابانا(Warf and Woof)نواب مرزا خان داغؔ (۱۸۳۱ء۔ ۱۹۰۵ء)کی والدہ وزیر بیگم(۱۸۱۱ء۔۱۸۷۹ء) کی نجی زندگی کے گرد بُنا ہے،جس کی ذات کسی نہ کسی نہج سے اُردو ادب کے نام ور شعرا وادباسے وابستہ رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ فاروقی نے کئی ایک شعرا کو اِس ناول میں کرداروں کی صورت میں پیش کیاہے،فی الاصل انھی تاریخی وادبی مشاہیر کا تذکرہ ذیل میں پیش ہے۔

اِس ناول کا سب سے اہم تاریخی و ادبی کردارظلِ سبحانی،ابوالظفرسراج الدین بہادر(۱۷۷۵ء۔۱۸۶۲ء) کاہے،جواکبر شاہ ثانی(۱۷۶۰ء ۔ ۱۸۳۷ء) کی وفات کے بعد آخری مغل تاج دار کی حیثیت سے۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوا، لیکن اُس کی حکومت قلعے کی چار دیواری تک ہی محدود تھی۔بہادرشاہ ظفر دراصل ایک بے طاقت اور برائے نام بادشاہ تھا،جس کی حیثیت بعض معاملات میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ (Political Agent) کی سر زنش یا جواب طلبی کرنے کی بھی نہ تھی۔اِس کاواضح ثبوت یہ ہے کہ ولیم فریزر (William Faraser) (۱۷۸۴ء ۔ ۱۸۳۵ء) اور حکیم احسن اللہ خان(۱۷۹۸ء۔۱۸۷۳ء)کے درمیان تلخی کے بعدجب حکیم احسن اللہ خان کو انگریزوں کی طرف سے نا

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

پسندیدہ شخص قرار دیا گیا تواُس کی ساکھ کی بحالی کے لیے۱۸۴۶ءمیں بہادر شاہ ظفرنے بہ نفسِ نفیس کوششیں کیں، لیکن انگریزوں کے دل سے وہ حکیم صاحب کے لیے کدورت کی گرد صاف نہ کرسکا۔

بہادرشاہ ظفر نے زینت محل(۱۸۲۳ء۔۱۸۸۶ء)سے ۱۸۴۰ءمیں اُس وقت شادی کی جب اُس کی عمر تریسٹھ برس اور زینت محل کی عمر محض اُنیس برس تھی۔بلا شبہ ملکۂ دوراں نے ظلِ سبحانی کو اپنے بس میں کر رکھا تھا اور بہادر شاہ ظفر بھی اُس کی محبت میں بہ مشکل ہی اُس کی کوئی بات رد کیا کرتا تھا۔[۴] اِس ضمن میں خلیق احمد نظامی (۱۹۲۵ء۔۱۹۹۷ء)لکھتے ہیں:

> "ملکہ زینت محل نے بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل حاصل کر لیا تھا۔سلطنت کے تمام کار پردازوں کے نام حکم جاری کیا گیا تھا کہ جس دستاویز پر نواب زینت محل کی مہر نہ ہوگی وہ غیر معتبر سمجھا جائے گا۔"[۵]

زینت محل نے اپنے بیٹے جواں بخت(۱۸۴۱ء۔۱۸۸۴ء)کوولی عہد بنوانے کے لیے،دیگر کوششوں کے ساتھ ساتھ بالآخر بہادرشاہ ظفر کو بھی مجبور کردیا کہ وہ بھی انگریزحکام کو تحریری طورپر لکھ کر بھیجیں۔یوں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر زینت محل کے ہاتھوں محض ایک کھلونا تھا۔دوسرے یہ کہ جب زینت محل داغؔ کی والدہ وزیر خانم کو قلعہ بدر کرتی ہے تواِن حالات میں بہادرشاہ ظفر اپنا کوئی مثبت کردار ادا کرنے میں کُلیتاً ناکام رہا۔ظلِ سبحانی کو اپنے بیوی بچوں اور قلعہ کی خانگی زندگی سے مکمل آگاہی رہتی تھی، مگروہ اکثر چپ سادھ لینے کوہی اپنی کام یابی تصوّر کیا کرتا تھا۔کہہ سکتے ہیں کہ بہادرشاہ ظفر ایک بے بس اور غیر فعّال قسم کے بادشاہ کا کردار ہے۔

اِس ناول کاایک اوراہم کرداروِلی عہدمرزامحمدسلطان فتح الملک شاہ بہادرعرف مرزا غلام فخرالدین(۱۸۱۲ء۔۱۸۵۶ء)،ظلِ سبحانی بہادرشاہ ظفر کا بیٹا،جوشکل وصورت میں بھی ہوبہو اپنے باپ کی طرح تھا،مگر اُس کا چہیتاہرگزنہ تھا۔فنِ رقص و موسیقی میں مہاراج کا درجہ رکھنےوالایہ کردارشہ سواری اورنیزہ بازی میں بھی برق تھا۔انگریزی،اُردواورفارسی کاماہرہونےکےساتھ ساتھ شاعری میں اُستاد ابراہیم ذوقؔ(۱۷۹۰ء۔ ۱۸۵۴ء)کاشاگرد بھی تھااور"رمز"تخلص کیا کرتا تھا۔وزیرخانم کے حسن و جمال کی شہرت سن کر شبیہ سازسے اُس کی تصویر بنواکر اُسے دیوانوں کی طرح چھپ چھپ کردیکھتاہے،گوکہ اِس سے قبل بھی وہ دو شادیاں کر چکا تھا،مگر وہ اپنی پہلی دونوں بیویوں سے کسی طور بھی خوش نہ تھا۔وزیر خانم کے

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

سلسلے میں وہ اُستاد ذوقؔ سے مشورہ اور حکیم احسن اللہ خان اور امام صہبائی (۱۸۰۲ء۔ ۱۸۵۷ء) سے مدد حاصل کرتا ہے۔ بالآخر وزیر خانم سے اُس کی شادی ہو جاتی ہے۔ اِس سارے عمل میں میرزا فخرو سلطان کا کردار ایک ولی عہد اور شاہ زادے کے بجائے ایک دل پھینک عاشق کی طرح معلوم ہوتا ہے، تاہم بیدار مغزی، خوش گفتاری، شاہی جاہ و جلال اور حالاتِ حاضرہ سے آگاہی اُس کے کردار کی اہم خوبیاں ہیں۔

ظلِ سبحانی بہادر شاہ ظفر کے اُستاد کے منصب پر فائز اُستاد ابراہیم ذوقؔ کا کردار اِس ناول میں قدرے مختصر مدت کے لیے قاری کے سامنے آتا ہے، مگر اہمیت کے اعتبار سے اس کا کردار اِس ناول میں ناگزیر کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ قلعے میں اس کا بے حد احترام اور خوب آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ اُسے قلعے کی اندرونی سیاست سے براہِ راست تو کوئی سروکار نہ تھا، تاہم انفرادی سطح پر اُسے قلعے کی داخلی سیاست سے مکمل آگاہی رہتی تھی۔ مختصر یہ کہ اُستاد ابراہیم ذوق کا کردار ایک دُور اندیش، حاضر دماغ اور پُر اعتماد شخص کا کردار ہے۔

مرزا غالبؔ (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) اِس ناول میں ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والی ایک اور ادبی شخصیت کا کردار ہے۔ ناول کے دوران مرزا غالبؔ اور نواب شمس الدین احمد خان (۱۸۰۹ء۔۱۸۳۵ء) کی درپردہ لہجے و کلام کی ترشی سے اُن کے باہمی مناقشات کی تہیں آہستہ آہستہ کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ولیم فریزر کے ہاں شعر و سخن کی محفل میں شمس الدین احمد خان اور مرزا غالبؔ کے مابین ہلکی سی غیر محسوس نوک جھونک ہوئی، جو جلد ہی رفع ہو گئی، تاہم باطنی تلخیوں کو جاننے والے بہ خوبی سمجھ گئے۔ یہ محفل فی الاصل وزیر خانم کی توجہ حاصل کرنے کے لیے برپا کی گئی تھی۔ مرزا غالبؔ، شمس الدین احمد خان کے رشتے کے بہنوئی بھی تھے۔ مرزا غالبؔ نے نواب شمس الدین احمد خان کی دشمنی میں درپردہ زیادہ اور اعلانیہ ذرا کم کم حصہ لیا۔ مرزا غالبؔ نے نواب امین الدین احمد خان (پ:۱۸۱۴ء) کی جائیداد کی بازیابی کے لیے لوگوں کو تعارفی و سفارشی خطوط بھی لکھے۔ گو کہ نواب شمس الدین احمد خان مال و مرتبے کے لحاظ سے دنیاوی سطح پر اُن پر فوقیت رکھتے تھے، مگر غالبؔ اُنھیں اُن کی غیر کفو والدہ کی وجہ سے نسباً کم تر سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ: "غالب کے دل میں شمس الدین احمد کے تئیں کشاکش کا احساس لازمی تھا۔"(۶) ولیم فریزر کے قتل کے ضمن میں مرزا غالبؔ کو تفتیش کے لیے بلا یا گیا تو اُس نے نواب شمس الدین احمد خان کے حق میں ایک لفظ نہ کہا۔ نہ صرف یہ بل کہ مرزا غالبؔ کا عناد نواب شمس الدین احمد خان کے خلاف اُس زمانے کی

تحریروں میں بھی ملتا ہے۔مرزا غالبؔ کی طبیعت میں موقع شناسی کاملکہ حد سے سوا تھا،تاہم اِس کے ساتھ ساتھ وہ ایک فراخ دل انسان بھی تھے،اِس کا ثبوت یہ ہے کہ نواب شمس الدین احمد خان کے ساتھ مرزا غالبؔ کے تعلقات انتہائی خراب تھے،مگرجب نواب مرزا داغؔ اُن سے ملنے آئے تو اُنھوں نے نواب مرزا داغؔ کی دل سے آؤ بھگت کرتے ہوئے بے انتہا اپنائیت سے کہا کہ : "اماں تم ہی نواب مرزاہو،بھائی شمس الدین احمد کے بیٹے۔آؤ آؤ میں تمھیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔"(۷)پھر مرزاغالبؔ نے مرزا داغؔ کونہ صرف بڑے پیار سے اپنے دائیں جانب بٹھایا،بل کہ اُن کی شاعری کی دل کھول کر تعریف بھی کی،تاہم مجموعی طور پر مرزاغالبؔ کا کردار ایک منفی سوچ کے حامل فرد کانقشہ پیش کرتا ہے۔

اساسی طورپر تو مرزا داغؔ دہلوی(۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء) ایک خوش فکر شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں،مگر اِس ناول میں فاروقی نے اِس ادبی شخصیت کو ایک کردار کی صورت میں پیش کیاہے۔مرزا داغؔ کی طبیعت میں انتہا درجے کی قوتِ برداشت پائی جاتی تھی۔مثال کے طور پر ظہیر دہلوی(۱۸۲۵ء۔۱۹۱۱ء) جب ولی عہد میرزا فخرو سلطان کا کسی مصوّر سے وزیر خانم کی تصویر بنوانے والا واقعہ داغؔ کے گوش گزار کرتاہے تو داغؔ اُس پر اپناکوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کرتا،حالاں کہ اُس کا باپ ایسے معاملات میں زندگی اور موت کے فرق کو بھول جاتاتھا۔اِس ضمن میں جہانگیرہ اورولیم فریزر کے ساتھ منسوب من گھڑت واقعہ ہی مثال کے طورپر کافی ہے۔اپنی ماں کی طوائفیت کاحال بھی داغؔ کو معلوم تھا،مگراِس بات پر بھی نہ تووہ رنجیدہ خاطر ہوا اورنہ ہی اُس نے اپنی ماں کو کبھی اُس کی گذشتہ زندگی کی غلطیوں کاطعنہ دیا۔مرزاداغؔ اِس ناول میں صرف اپنی والدہ سے ہی کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتاہے۔داغؔ کا بچپن دلاسوں اور تسلیوں میں گزرا۔نہ صرف یہ کہ مرزاداغؔ کواپنے باپ کی محبت سے محرومی ہوئی،بل کہ بعدازاں اُسے ماں کی محبت سے دست کش ہوکررام پور جاناپڑااور ساتھ ہی ساتھ نانا کی محبت سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔وقت کے ساتھ ساتھ داغؔ کی باتوں میں پختگی اور سنجیدگی آتی چلی گئی۔داغؔ اپنی ماں کی محبت میں اُس کا ہر فیصلہ قبول کرلیتاہے۔اپنی مرضی سے بہت کم فیصلے لیتاہے،جو ماں کہتی وہی کرتاہے اوروہ جہاں رہنے کا مشورہ دیتی ہے،وہ وہیں رہنا شروع کر دیتا ہے۔آغا تراب علی اور میرزا فخرو سے شادی کے وقت داغؔ اپنی ماں کے راستے کی دیوار بننے کے بجائے اُس کی دل جوئی کرتاہے اور اُس کے اَن دیکھے اورخود ساختہ خدشات و ترددات کو اپنی فہم و فراست سے دُور کرنے کی کوشش کرتاہے۔واضح رہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے مرزاداغؔ کی نجی زندگی

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

کے محض پاک صاف اور گھریلو زندگی کے خاص خاص پہلوؤں کو ہی مس کیا ہے، باقی وہ سب کچھ حذف کر گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ اِس ناول میں داغؔ کا کردار ایک کم گو، شائستہ کلام، صلح پسند اور ایک سنجیدہ فکر شاعر کا کردار ہے۔

اِسی طرح وزیر خانم کی کوکھ سے جنم لینے والا آغا مرزا تراب علی کا فرزند شاہ محمد آغا مرزا (۱۸۴۳ء۔ ۱۸۹۸ء)، جو وضع قطع میں ہو بہو اپنے باپ کی تصویر معلوم ہوتا تھا، بڑا ہو کر اُس نے بھی فنِ شاعری میں خوب نام کمایا۔ زبانِ فارسی میں اُس نے "شائق"، جب کہ ہندی میں "شاغل" تخلص اختیار کیا اور بعد ازاں وہ بساطِ شعر و شاعری میں اُستادی کے درجے پر فائز ہوا۔ علاوہ ازیں خورشید مرزا کا کردار بھی اِس ناول کا ایک ضمنی کردار ہے۔ میرزا فخرو بہادر اور وزیر خانم نے خورشید مرزا کی پرورش و پرداخت انتہائی نازو نعم سے کی۔ وزیر خانم کی تربیت کی وجہ سے خورشید مرزا کو بھی شعر وشاعری کا ازحد شوق تھا۔ اپنے لیے اُس نے "خورشید" تخلّص پسند کیا۔ فخرو بہادر کے انتقال کے بعد جب وزیر خانم کو قلعہ بدر کیا گیا تو خورشید مرزا نے بھی قلعہ میں رہنا گوارا نہ کیا اور گردن تان کر وزیر خانم کے ساتھ قلعہ سے روانہ ہو گیا۔ مختصر یہ کہ اِس کردار کی فہم و فراست اور صلابتِ کردار قاری کو بہت متاثر کرتی ہے:

> "اگلے دن مغرب کے بعد قلعۂ مبارک کے لاہوری دروازے سے ایک چھوٹا سا قافلہ باہر نکلا۔ ایک پالکی میں وزیر، ایک بہل پر اس کا اثاث البیت، اور پالکی کے دائیں بائیں گھوڑوں پر نواب مرزا خان اور خورشید مرزا۔ دونوں کی پشت سیدھی اور گردن تنی ہوئی تھی۔ محافظ خانے والوں نے روکنے کے لئے ہاتھ پھیلائے تو میرزا خورشید عالم نے ایک ایک مٹھی اٹھنیاں چونیاں دونوں طرف لٹائیں اور یوں ہی سر اٹھائے ہوئے نکل گئے۔ "(۸)

شاہ نصیر (۱۷۵۶ء۔ ۱۸۳۸ء) کا تذکرہ اِس ناول میں وزیر خانم کے اُستاد کی حیثیت سے ایک غائب کردار کے طور پر آیا ہے۔ وزیر خانم کو "زہرہ" تخلص شاہ نصیر کی جانب سے ہی عطا ہوا تھا۔ شاہ نصیر کی اصلاح کا طریقہ یہ تھا کہ وہ وجہ بتائے بغیر براہِ راست اصلاح کیا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ اُن کا ترنم اور لحن بھی اُن کی اضافی خوبیوں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ الفاظ کی خوب صورت ادائیگی میں بھی اُنھیں کمال حاصل تھا۔ شاہ نصیر کے کردار کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اُن میں دوسروں کے لیے محبت اور عزت و تکریم

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

کاجذبہ حد سے سوا تھا۔وہ اچھے سبھاؤ کے انسان تھے اورشاگردوں کی حوصلہ افزائی کرنااُن کا شیوہ تھا،یہی وجہ ہے کہ ساری زندگی وزیر خانم اُنھیں رہ رہ کریاد کرتی ہے، بالخصوص اُن کے دکن چلے جانے کے بعد تو وزیرخانم کو اُن کی یادبہت ستانے لگتی ہے:

> "اسے شاہ نصیر صاحب یادآئے کہ ان کی آواز میں عجب ترنم تھا،عجب لحن تھا۔اورہر حرف کو وہ کس قدر خوبی سے ادا کرتے تھے،مولویوں کی طرح اکڑ اکڑ کر نہیں،جیسے گلا صاف کر رہے ہوں،بل کہ اِس طرح گویا انگور کی داربست پر نرم چھینٹے پڑ رہے ہوں۔"(۹)

گھنشیام لال عاصی(۱۷۹۸ء۔۱۸۶۵ء)زیربحث ناول میں ادبی دنیاسے تعلق رکھنےوالا بہادری اوربے باکی کی صفات سے مملوایک اوراہم کردار ہے،جسے فاروقی نے اِس ناول میں ایک دبنگ کردار کے روپ میں پیش کیا ہے۔اِس کا بین ثبوت یہ ہے کہ گھنشیام لال عاصی نے تریسٹھ سالہ بہادرشاہ ظفر اورانیس سالہ زینت محل سے شادی کے موقع پر قطعہ تاریخ کے نام پر اُن کا خوب استہزا اُڑایا۔اِسی طرح شاہ نصیرؔ اور اُستادذوقؔ کی غزلیات کی بحث میں بھی اُنھوں نے شاہ نصیرؔ کا پُرزور اور بلند بانگ انداز میں ساتھ دیا،حالاں کہ دوسری جانب اُستادذوقؔ کی طرف داری بہادر شاہ ظفر کر رہے تھے،لیکن اِس کے باوجود گھنشیام لال عاصی نے حق اورسچ کاساتھ دیا،اوربادشاہِ وقت سے ذرہ برابر خائف نہیں ہوا۔

امام بخش صہبائی ولی عہدمیرزافخروسلطان کے اُستاد اورقریبی دوستوں میں سے تھے۔وہ شاعری،معمّا گوئی،عروض و بدیع وبیان میں کمال درجے پرفائزہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شعر کے سچے قدر دان بھی تھے۔چوں کہ امام بخش صہبائی اپنے زمانے کے فارسی زبان وادب کے جید عالم اوردلی کالج کے اُستاد بھی تھے،اِس لیے ایک عرصے سے میرزا فخرو سلطان کو فارسی کے درس دیتے چلے آرہے تھے۔ وزیرخانم اور میرزا فخروسلطان کی شادی میں بھی امام بخش صہبائی کا سب سے اہم کردار تھا۔امام بخش صہبائی قلعے کی اندرونی سیاست سے بہ خوبی آگاہ ہونے کے باوجود عملی سطح پر قلعے کےانتظامی وسیاسی معاملات دُور رہتے تھے۔مختصر یہ کہ امام بخش صہبائی ایک ظریف الطبع فرض شناس،معمولی مشاہدہ،مگرتیز ذہن کے انسان تھے۔اِسی طرح میرزا فخرو بہادرسلطان کے دوست مرزاقادربخش صابر(۱۸۰۸ء۔ ۱۸۸۲ء)بھی معمّاگوئی اورشعروسخن کے دل دادہ تھے۔اِس ضمن میں وہ امام بخش صہبائی کے

شاگرد تھے، تاہم اُن کی اکثر و بیشتر مرزا فخرو سلطان سے محفلیں رہا کرتی تھیں۔ مرزا قادر بخش صابر مرزا فخرو سے صرف دو سال بڑے تھے، اِس کے باوجود مرزا فخرو سلطان اُن کا بہت احترام کرتے تھے اور اُن کی آمد پر تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ناو ل میں اِس کردار کی حیثیت خانہ پُری سے زیادہ نہیں۔

اِسی طرح نواب یوسف علی خان، جس نے وزیر خانم کی منجھلی بہن عمدہ خانم کو بغیر نکاح کے اپنے حرم کی زینت بنا رکھا تھا، ناول میں اُس کا کردار ہمہ وقت نوابی ترنگ میں ڈوبے ہوئے ایک ایسے شخص کا تاثر پیش کرتا ہے، جو اپنی نوابیت کے خول سے ایک ثانیے کے لیے بھی باہر نہیں نکلتا۔اُس کے رہن سہن، نشست و برخاست، لباس و طعام اور اندازِ گفتگو میں ایک ایسا رکھ رکھاؤ اور شانِ امارت پائی جاتی تھی کہ ایک ہی نظر میں لوگ اُس کی نوابی شان و شوکت سے مرعوب ہو جاتے تھے، تاہم وزیر خانم کی خانہ آبادی کے لیے کی گئی مساعی، اُسے ایک پُر خلوص بہی خواہ اور امداد گار کا منصب بھی عطا کرتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ نواب یوسف علی خان ایک خوش فکر شاعر بھی تھے۔دہلی میں اُنھوں نے حکیم مومن خان مومن (۱۸۰۰ء۔۱۸۵۱ء) کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا، جب اُن کی وفات کے بعد مرزا غالبؔ کی شاگردی اختیار کی۔مومن کی شاگردی میں وہ "یوسف" تخلص کیا کرتے تھے، مگر غالبؔ نے اُن کا تخلص بدل کر "ناظم" تجویز کیا اور نواب یوسف علی خان کو اِسی تخلص سے شہرت حاصل ہوئی۔رام پور آنے کے بعد نواب موصوف نے یہاں باقاعدہ مشاعروں کا اہتمام کیا، جنھیں بہ طورِ خاص شہرت حاصل ہوئی۔

ازاں بعد نواب شمس الدین احمد خان کے سب سے چھوٹے بھائی نواب ضیا الدین احمد خان (۱۸۲۱ء۔۱۸۸۵ء) کا کردار آتا ہے، جو اُردو، فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی ایسی زبانوں میں خاص مہارت رکھتے تھے۔اُن کا زیادہ تر وقت حصولِ علم میں صرف ہوتا تھا۔ ادب، انشا، تاریخ، سوانح رجال، تفسیر و حدیث، نجوم و ہیئت ایسے فنون میں اُنھیں مکمل دست گاہ حاصل تھی۔نواب ضیا الدین احمد خان کو اپنے سوتیلے بھائی نواب شمس الدین احمد خان سے بے حد محبت تھی اور نواب شمس الدین احمد خان کا رویہ بھی اُن کے ساتھ بہت اچھا تھا۔وہ بھی اپنے بھائی کو اچھے لفظوں سے یاد کیا کرتے تھے۔نواب امین الدین احمد خان (۱۸۴۱ء۔۱۸۶۹ء) کے ساتھ اُن کے تعلقات خاصے خراب تھے، کیوں کہ نواب امین الدین احمد خان کا رویہ اُن کے ساتھ آمرانہ تھا:

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

"ان میں اور بڑے نواب امین الدین احمد خان میں مکمل صفائی اور ہم آہنگی نہ تھی۔ ضیاالدین احمد خان کے خیال میں امین الدین احمد خان کا رویہ چھوٹے بھائی کے ساتھ غیر منصفانہ تھا اور اُنھیں ریاست کے محاصل و مراتب سے برابر کا حصّہ نہ ملتا تھا جس کے بخیال خود حقدار تھے۔دونوں بھائیوں کی عمروں میں خاصا تفاوت تھا اور چھوٹے بھائی کے بقول اِس تفاوت کے نتیجے میں باپ کی سی دلجوئی اور مہرورزی کی جگہ امین الدین احمد خان ان کے ساتھ آمرانہ اور مستبدانہ رویہ رکھتے تھے۔"(۱۰)

ضیاالدین احمد خان وزیر خانم سے شادی کا بھی خواہاں تھا،مگر دو تین بار وزیر خانم کے پاس آنے کے باوجود و ہ اپنے مقصد میں ناکام رہا اور ہزیمت الگ اُٹھانا پڑی۔نوابی ٹھاٹ بھاٹ کے حامل اِ س کردار میں قوتِ اعتمادی کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے۔

اِس ناول میں امین الدین احمد خان کے صاحب زادے علاء الدین احمد خان علائی(۱۸۳۳ء۔۱۸۸۴ء) کا سرسری سا تذکرہ ایک شعری قطعے کی بنیاد پر کیا گیا ہے،جو علاء الدین احمد خان علائی نے امرا کے کھانو ں کے ذوق کی مناسبت سے غالبؔ کے ایک قطعے کے جواب میں لکھا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ علائی کا کردار اِس ناول میں صرف ایک شاعر کی حیثیت سے نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہےاوریوں بھی علائی اور اُس کے مذکورہ قطعے کاتذکرہ اگراِس ناول میں نہ بھی کیاجاتاتب بھی ناول کی کہانی اوراُس کی فنی وفکری حیثیت میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا،کیوں کہ علائی اور اُن کا قطعہ ناول کی مجموعی کہانی سے کلی طور پر صریحاً کوئی سروکار نہیں رکھتا، لہٰذا اِس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔اِسی طرح نواب کلب علی خان(۱۹۳۲ء۔۱۸۸۷ء) کا کردار بھی اِس ناول میں صرف نام کی حد تک اپناوجود رکھتا ہے۔گو کہ نواب موصوف نے دہلی اور لکھنؤکے درباروں کے خاتمے کے بعدوہاں کے شعرا و ادبا کی جس طرح ان کے والد نواب یوسف علی خان اور بہ ذاتِ خود اُنھوں نے سرپرستی کی،وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔(۱۱)، تاہم اِس ناول میں فاروقی نے نواب کلب علی خان کے بارے میں صرف اِس حد تک قاری کے لیے معلو مات فراہم کی ہے کہ وہ نواب یوسف علی کے صاحب زادے تھے۔

وزیر خانم کی بیٹی سوفیہ(Sophia)کا پوتا سلیم جعفر،جس کا اصل نام حسیب اللہ قریشی تھا،بنیادی طور پر ایک لائق فائق، نفاست پسند، نستعلیق اور فروغِ علم کے لیے بلا معاوضہ کام کرنے والا ایک مخلص شخص تھا۔اُردو کا نام ور ادیب،نقاد اور ماہرِ عروض ہونے کے ساتھ ساتھ اُس نے نظیر اکبر آبادی،غالب اور دیگر کئی کلاسیکی شعرا پر بھی قلم آزمائی کی۔علاوہ ازیں وہ سنسکرت،ہندی اور انگریزی زبان وادب پر ید طولیٰ رکھتا تھا۔تقسیمِ ہندوستان سے قبل وہ ایک اچھی ملازمت پر متمکن تھا،لیکن قیام پاکستان کے بعد اُسے اُس کی اہلیت و قابلیت کے مطابق کوئی مناسب روزگار نہ مل سکا۔یوں وہ میر پور خاص میں ایک مقامی وکیل محمد لطیف گاندھی کے ہاں معمولی ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگا،تاہم اُس نے تحقیق وتنقید کا کام ساتھ ساتھ جاری رکھا اور انتہائی عرق ریزی سے "تحقیق اللغات" کے نام سے ایک شان دار لغت بھی لکھا۔ایک حادثے میں اُس کی دائیں کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔یوں مسلسل پلنگ پر پڑے رہنے سے اُس کے سارے بدن پر آبلے اور زخم نکل آئے،جن میں پیپ اور بدبو پیدا ہوگئی،جس کی وجہ سے اُسے ایک رشتے کے ماموں کے ہاں کراچی لے جایا گیا،جہاں وہ کچھ عرصہ بعد دنیاے فانی سے کوچ کر گیا۔اُس نے مرنے سے قبل اپنے بیٹے شمیم جعفر کے نام تمام کاغذات محمد لطیف گاندھی کے حوالے کر دیے،تاکہ بعد میں اُس کے بیٹے کو معاشی اعتبار سے کسی طرح کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔مختصر یہ کہ سلیم جعفر کا کردار ایک عدد محنتی اور انتہائی مشفق باپ کا کردار ہے،جو اپنی اولاد کے لیے بہتر مستقبل کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہا۔

بعینہٖ اعجاز احمد قریشی عرف شمیم جعفر(ف:۱۸۵۹ء)اپنے والد وسیم جعفر کی طرح اُردو اور فارسی میں اچھی خاصی دست رس رکھتا تھا۔اُس کی شادی اُس کے والد کی ایک اینگلو انڈین قرابت دار خاتون ہرمائنہ ٹیمر (Hermione Mortimer)کی اکلوتی بیٹی پرڈیٹا مار ٹیمر(Perdita Mortimer)سے ہوئی تھی۔اُسے نواب مرزا داغ کی والدہ وزیر خانم،جو رشتے میں اُس کی پردادی لگتی تھی، اُس کے حالات جمع کرنے میں خاص رغبت تھی،جو اُس نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے مختلف کتابوں،بزرگوں کی یادداشتوں اور بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر جمع کیے تھے۔شمیم جعفر کی زندگی کا دوسرا حصہ دُکھ اور الم کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔اِس دور میں وہ ایک حادثے میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔یوں اُس کی ملازمت بھی جاتی رہی اور وہ بنگال سے واپس آکر میر پور خاص میں اپنے والد کے پاس رہنے لگا۔اِس دور میں شمیم جعفر نیم پاگل اور ذہنی طور پر ماؤف یا

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

مخبوط الحواس ذہن کے ساتھ ہر روز کشمیر کی وادیوں میں سوٹ بوٹ میں ملبوس ہوکر انگریزی بولتاہوا دکھائی دیتا تھا۔بعض اوقات اپنے آپ کو اب بھی چائے کے باغ کا مینیجر خیال کیا کرتا تھا۔اِسی بنا پر بچے اُس کا مذاق اُڑاتے اور اُسے "ٹائم بابو" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔باپ کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد شمیم جعفر بھی اللہ کو پیارا ہوگیا۔شمیم جعفر کوخوش خوئی اور خوش اُسلوبی کے ساتھ گفتگو کرنے میں کمال حاصل تھا۔علاوہ ازیں اُسے حالات کی نزاکت کو سمجھنے کا شعور،پیچیدہ معاملات کو سلجھانے کی خاص اہلیت اور انسانی نفسیات سے بھی گہری واقفیت حاصل تھی۔

زیر بحث ناول کاایک اوراہم کردارو سیم جعفر کاہے۔وسیم جعفر کے والد شمیم جعفر کوجب بنگلہ دیش میں چائے کے باغ میں حادثہ پیش آیا تواُس وقت وسیم جعفر کی عمر محض دس بارہ سال تھی۔اپنے دادا سلیم جعفراورباپ شمیم جعفر کی وفات کے بعد اُس کی والدہ اُسے باپ دادا کی تہذیبی و ادبی روایات سے دُور رکھنا چاہتی تھی،مگر اُس نے اپنی ماں پرڈیٹامار ٹیمر کی خواہشات کے بالکل برعکس رویہ اختیار کرتے ہوئے شعوری طورپر اپنے آباؤاجداد کے آداب واطواراورروایات کواپنی زندگی کا حصہ بنایا۔اُس نے اُردو،فارسی اورانگریزی میں خصوصی طور پر دست گاہ حاصل کی ۔علاوہ ازیں اُسے مغل طرز کی مصوّری اور انیسویں صدی کے بعض ایسے گھرانوں کے حالات جمع کرنے کا بھی شوق تھا،جواپنے زمانے میں ہند اسلامی تہذیب کے علم وفن بالخصوص شاعری،مصوّری اورموسیقی میں نمایاں مقام رکھتے تھے ۔وہ ماضی کی قبریں کھودکرہنداسلامی تہذیب کے مشاہیر علم وادب کو ازسرِ نو زندہ کرنا چاہتا تھااوراِس بات پر اُس کاپختہ ایمان تھا کہ وہ ایسا کرسکتاہے۔اِس مقصد کے حصول کے لیے وہ فرصت کے لمحات میں زیادہ تر انڈیا آفس لائبریری میں اٹھارویں صدی کے کاغذات کی چھان پھٹک اور ہند اسلامی تہذیب کے گم شدہ نقوش کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔

ناول کاتیسرا باب"وسیم جعفر"،جواوّل تاآخر لندن کے پس منظر میں لکھاگیا ہے،اُس میں وسیم جعفر اور ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی کے درمیان علم افروزاورذات کشاگفتگوہوتی ہے۔وسیم جعفر کی طبیعت میں دورانِ گفتگو سسپنس اور سنسنی پیدا کرنے کی زبردست صلاحیت پائی جاتی تھی۔جن لوگوں نے وزیر خانم کے بارے میں تحریری طورپر زیادتی کی اُن کےذکرپروہ کسی قدرسیخ پااورترش کلام ہو جاتا تھا۔ مولاناامحمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء)سےنالاں ہونےکی وجہ توصاف ہے،لیکن وہ نیازفتح پوری

(۱۸۸۴ء۔۱۹۶۶ ء) اور مرزا فرحت اللہ بیگ(۱۸۸۳ء۔۱۹۴۷ء)سے بھی اِس ضمن میں ناراض دکھائی دیتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں اہلِ قلعہ اور داغؔ کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا۔اُس کے دل میں انگریزوں کے خلاف بھی شدید نفرت تھی۔

وہ برٹش لائبریری کے شعبہ کمپنی مصوّری کے اسسٹنٹ کیپر کے عہدے پر فائز تھا۔بظاہر وہ اپنی دنیا میں گم ایک دھان پان سا آدمی ،جو پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا تھا،مگر اُس نے اپنی بیماری کی کسی کو خبر نہ ہونے دی اور اپنی تلاش وجستجو میں مگن رہا۔اُس کے کردار کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ اُسے کچھ حاصل ہویا نہ ہو وہ اپنی جستجو سے دست بردار نہ ہوتا تھا۔گویا وہ اپنی دھن کا پکا،دھیمے مزاج کا حامل،خاموش طبع ، اصول پرست اور مسلسل محنت وجستجو میں زندہ رہنے والاانسان تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے رفقامیں یکساں طور پراحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔ بات بات میں شعری تراکیب اور محاورات وضرب الامثال کا بر محل اور حسبِ حال استعمال کا سلیقہ اُس کی گفتگو میں انفرادیت کا حسن پیدا کر دیتا تھا۔وہ مغربی شعرا سے بھی گہری واقفیت رکھتا تھا۔پرانی کتابوں، دستاویزات،تصاویر اور کلاسیکی شعرا سے دل چسپی اور نوادرات جمع کرنے کا اُسے بے انتہا شوق تھا،مختصر یہ کہ وہ اپنی ذات میں گم معلومات کا ایک خزانہ تھا:

> "وسیم جعفر کا دماغ اور بہت سی چیزوں کے علاوہ کسی بڑے عجائب گھر کے اُن کمروں سے مشابہ تھا،جن میں وہ اشیا رکھی جاتی ہیں جنھیں نمائش پر رکھنا کسی باعث ممکن نہیں ہوتا۔ایسے کمروں میں ایک سے ایک عجیب، دور ازکار،غیر متوقع اور نادر سامان بھرا ہوتا ہے۔وسیم جعفر صاحب بھی ایسی ہی انوکھی معلومات کا خزانہ تھے۔" (۱۲)

ازاں بعد ادب گلشن آبادی (۱۹۲۲ء۔۱۹۹۰ء) اور پروفیسر کرار حسین (۱۹۱۱ء۔۱۹۹۹ء) کے کردار، جو سلیم جعفر کے ساتھ مل کر ادبی تقاریب منعقد کیا کرتے تھے،گویا سلیم جعفر کی زندگی میں دل چسپی اور رنگا رنگی پیدا کرنے کے لیے اِن دونوں اصحاب کا بڑا اہم کردار رہا، بالخصوص پروفیسر کرار حسین کی فرمائش پر سلیم جعفر نے شاہ عبدالطیف بھٹائی کالج میں تقابلی لسانیات کے موضوع پر کئی کام یاب لیکچر دیے تھے۔علاوہ ازیں نواب زین العابدین خان عارف انیس بیس سالہ نوجوان،جس کی شادی نواب شمس

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

الدین احمد خان کی ہمشیر نواب بیگم سے ہوئی۔نواب زین العابدین خان عارف عربی،فارسی میں بہت اچھی،جب کہ تاریخ،ہیئت اور فلسفہ ایسے علوم میں معمولی استعداد رکھتاتھا۔شاعری میں وہ غالب کا شاگرد تھا۔نواب ہونے کے باوجود اُس کی مالی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔نواب زین العابدین خان عارف تپ دق کادائم المرض تھااور اِسی بیماری کی وجہ سے اُس کی موت ہوئی۔بعینہٖ نواب شمس الدین احمد خان کی دوسری ہمشیر جہانگیرہ بیگم کا شوہر میرزا اعظم علی خان سترہ اٹھارہ برس کا خوب صورت نوجوان،جو علم و فن سے بہ خوبی آراستہ تھا۔ اِس ناول میں اِن دونوں علمی و ادبی خصائص کے حامل کرداروں کی حیثیت محض خانہ پُری سے زیادہ نہیں۔

اِس ناول کے تاریخی وادبی کرداروں کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتاہے کہ کسی بھی ناول کے کرداروں کوفطرتِ انسانی کے تقاضوں کے مطابق عمل پیرا ہونا چاہیے اوراگرکوئی ناول نگار ایسا کرنے میں ناکام رہے توایسا ناول قاری کی توجہ حاصل کرنے سے بھی محروم رہ جاتاہے، لیکن اِس ناول میں یہ سقم بہ ہرحال موجود نہیں،کیوں کہ اِن کرداروں کے درمیان قاری یوں محسوس کرتاہے،جیسے وہ اپنے اِرد گرد کے افراد سے مل رہا ہو۔یعنی بعض کرداروں سے اُسے ہمدردی اور اُلفت سی ہو جاتی ہے اور بعض سے نفرت سی۔یہ کردار قاری کے ذہن پر اِس طرح حاوی ہو جاتے ہیں، جیسے کوئی زندہ انسان ہماری زندگی کو متاثر کرتاہے۔اِس ناول کو پڑھتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی کو اِن کرداروں سے گہری واقفیت ہی نہیں،بے پناہ ہمدردی اوراُنسیت بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اِس ناول میں ارتقائی انداز کے حامل کردار تخلیق کیے ہیں۔اِس ناول میں بعض کردار ایسے بھی ہیں،جن سے ہم روز ملتے ہیں،گویااِس ناول میں اجنبی دیس کے لوگوں کی کہانی نہیں،بل کہ ایسے لوگوں کا ذکرہے،جنھیں ہم جانتے ہیں۔انسانی زندگی میں ہم جن مختلف افراد سے ملتے ہیں،اُن کے بارے میں ہمیں سب کچھ معلوم نہیں ہوتا،اور نہ ہی وہ افراد ہمیں اپنے بارے میں سب کچھ بتاتے ہیں،مگرایک اچھا ناول نگار کرداروں کے بارے میں کچھ اِس ڈھب سے بیان کرتا ہے کہ وہ کردار ہمیں ہمارے پیا روں سے بھی زیادہ عزیز محسوس ہونے لگتے ہیں۔

اِس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ اِس میں چھوٹے چھوٹے کرداروں کو بھی نہایت توجہ اورسلیقہ مندی سے وضع کیا گیا ہے۔خاص طور پر ناول کے مرکزی اور ضمنی کرداروں کی ذہنی و نفسیاتی

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

کش مکش کی عکاسی کچھ اِس نہج پر کی گئی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہد اور زمانے سے متاثر ہوتے ہیں، بل کہ اپنی ذات سے اپنے عہد کے سماج کو بھی متاثر کرتے ہیں۔[۱۳] فاروقی نے اِن کرداروں کے ذریعے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی تاریخ و تہذیب کو پیش کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی اشتراکات کو بہ طورِ خاص پیش کیا ہے۔ بلا شبہ اِس ناول کے کرداروں کے ذریعے فاروقی نے اُس عہد کے نظامِ معاشرت کو بھی بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اِس ناول میں اِس عہد کی روح سمٹ آئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اِس ناول کے جملہ کردار تاریخی و ادبی دنیا کے جیتے جاگتے انسانی مرقعے ہیں، بل کہ بہ طور کرداراِس ناول کی بھی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ راست یہی ہے کہ اِس ناول کے ہر کردار کی اپنی ایک الگ دنیا ہے، جس میں وہ کردار پوری طرح پیوست و جذب ہے۔ چوں کہ اِس ناول کے اکثر کردار تاریخی وادبی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اِس کے باوجود یہ کردار موم کی گڑیا معلوم نہیں ہوتے۔ وہ اِس لیے کہ ایک ادب شناس ناول نگار نے اِن کرداروں کو اپنے عمیق تاریخی وادبی شعور کی بہ دولت حقیقت پسندی کے ساتھ مصوّر کیا ہے۔

حوالہ جات

۱. محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، سیّد نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟ یعنی ناول نگاری کا ٹکنیک، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۰ء، ص ۲۴

۲. محمد یٰسین، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳، ۱۴

۳. ارشاد حیدر، سیّد، کئی چاند تھے سر آسماں۔ ایک مطالعہ، مشمولہ خدا لگتی، (مرتبین) لئیق صلاح، ارشاد حیدر، حیدرآباد: الانصار پبلیکیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۷۷

۴. مہر، غلام رسول، ۱۸۵۷، لاہور: کتاب منزل، س ن، ص ۱۸

۵. خلیق احمد نظامی، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۳

۶. شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۱ء ص ۲۳۸

۷. ایضاً، ص ۶۵۶

۸. ایضاً، ص ۸۱۳

۹. ایضاً، ص ۱۷۴

۱۰. ایضاً،ص۱۶۶
۱۱. شکیبؔ،شبیر علی خاں،مؤلف،رام پور کا دبستانِ شاعری،رام پور:رام پور رضا لائبریری،۱۹۹۹ء، ص۲۷۷،۲۷۸
۱۲. شمس الرحمن فاروقی،کئی چاند تھے سرِ آسماں،ص۳۱
۱۳. رشید اشرف خان،ڈاکٹر،کئی چاند تھے سرِ آسماں۔ایک تجزیاتی مطالعہ،دہلی:براؤن بک پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء،ص۱۶۲